

سے مل سکتی ہے۔ یہی دین ان کی اس دنیا میں چکی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس نئے دور میں جو ہدیہ تقدیریں لکھی گئیں ہیں یا لکھی جا رہی ہیں۔ ان میں نوے فیصد پرانی باتوں کی تکرار ہے۔ وہ ہدیہ صرف اس لیے ہیں کہ عصر ہدیہ میں لکھی گئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ عصر ہدیہ کی صحیح نمائندگی نہیں کرتیں۔ ان میں زمانہ حاضر کے مسائل کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔

نتیجتاً یہ ہمارے دور کی ضرورت کو پورا نہیں کرتیں۔ اسی لیے یہ مسلم معاشرہ میں کوئی تبدیلی برپا نہیں کر سکیں۔ لہذا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت خالص علمی انداز میں قرآن مجید کی تفسیر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ قرآن کی ایسی تفسیر جس کا خطاب تمام اہل عالم سے ہو۔ قرآن کی اساسی تعلیمات اس کے مقاصد اور افکار کو مربوط اور خالص علمی انداز میں پیش کیا جائے جس سے دنیا متاثر ہو۔

.....

زوج اور سوت دو متقابل اصطلاحیں

ڈاکٹر حافظ محمد کلیل ادوج

استاذ المذہب والتفسیر، شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ کراچی

سوکن، سوت یا سوت وہ الفاظ ہیں جو ہماری زبان میں رائج ہو کر ہماری معاشرت کا حصہ بن گئے۔ خاصہ بن چکے ہیں۔ بد قسمتی اور لاعلمی سے ہم نے اسے فطرت اور شریعت بھی سمجھ لیا ہے۔ چونکہ سوت یا سوکن کے الفاظ منفی مطالب و مفاد پر مشتمل ہیں۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں سوکن یا سوت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اسلام میں جو تصور دیا گیا ہے کہ وہ سوت کی بجائے زوج کا ہے۔ لیکن کم فہموں نے زوج کو سوت پر محمول کر رکھا ہے۔ پھر سوت کے لفظ سے سوتا یا (اردو) اور سوتا یا (ہندی) کے الفاظ بنائے گئے ہیں۔ جس کے معنی ہیں۔ دو سوتوں کے درمیان کی دشمنی۔ (۱)

کتابستان انگلش ڈکشنری میں اس کے معنی یوں الفاظ لکھے گئے ہیں۔
Heart Burning Caused by Co-Wife۔ علمی لغت میں سوت کے لفظ کے ساتھ،
جو محاورے درج کیئے گئے ہیں۔ ان میں بھی منفی معنی موجود ہیں۔ مثلاً "سوت بھلی، سوتا یا"۔ یعنی سوکن کی اولاد سوکن سے بھی بری ہوتی ہے۔ سوت کا لانا جی کا جلا نا۔ یعنی دوسری عورت کو لانا۔ پہلی کو زندہ درگور کرنے کے برابر ہے۔ (۲) کتابستان اردو انگلش ڈکشنری میں لکھا گیا ہے۔ سوت پر سوت اور جلا یا یعنی
A third Co-wife is worse then the second for the first one. (۳)

سوکن یا سوت کا لفظ اردو زبان میں اس بیوی کے لیے بولا جاتا ہے، جو پہلی بیوی پر لائی جائے۔ اسی طرح ایک خاوند کی دو بیویاں بھی باہم سوکن کہلاتی ہیں۔ اردو ادب میں سوکن کے لفظ کے ساتھ بھی کئی کہادیں مشہور ہیں۔ مثلاً سوکن بری ہے چون کی اور سا بیٹھے کا کام، کاٹا یا اگر مل کا اور بدردی کی گھام۔ یعنی سوت برائے نام ہوتا بھی بری ہے۔ یہی حال شرکت کے کام کا ہے۔ کرمل کاٹا اور برسات

کی محبت بھی اچھی نہیں (کھام۔ محبت۔ پسند) (جامع الامثال)
سو کن بھگتی جائے اور سو تپا نہ بھگتا جائے۔ یعنی سو کن کے مقابلے میں انکی اولاد سے زیادہ دکھ پہنچتا ہے۔
(ماخوذ: نجم الامثال)

سو کن تو چون رہ جاتی کی بھی بری۔ یعنی سوت چاہے ہر چیز اور کمتر ہو، بہر حال گوارا نہیں۔ نہ جانے کس وقت نقصان پہنچا دے، حریف بہر صورت حریف ہے۔

سو کن چاہا، کس کو بھایا۔ یعنی سو کن کی اولاد سے محبت نہیں ہوتی۔

سو کن زہر کی چھری، ایک بھی بری۔۔۔ سو کن مرگئی آنکھ پھوڑ گئی۔ (۴)

اسلام کے تعدد و ازواج کے تصور کو بے رحمانہ بلکہ ظالمانہ ثابت کرنے کے لیے سو کن یا سوت کے لفظ کا جو استعمال بلکہ سوت کا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ دراصل وحی خداوندی کے تقدس کو پامال کرنے کی سازش معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا ساری کہاوتیں اور محاورے دراصل ہندوستانی معاشرت کے عکاس ہیں۔ اس طرح کی کہاوتیں اور محاورے آپ کو عربی زبان و ادب میں نہیں ملیں گے۔ کیونکہ ان کے ہاں زوج اولیٰ کی موجودگی میں زوج ثانی کا تصور، مذکورہ بالا محاوروں اور کہاوتوں کے مطابق نہیں۔ ان کہاوتوں میں ہندی الفاظ کی آمیزش سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سو کن کے تعلق سے یہ سلیبیٹا، گھٹیا تصورات اور منفی نظریات کہاں سے آئے ہیں اور کس معاشرت کی چٹختی کھاتے ہیں۔

بلاشبہ ہندوستان کی مسلم معاشرت پر مذہب غیر کی معاشرت اثر انداز ہوئی ہے اور اس نے ان کے زبان و ادب میں اپنے منفی کلچر کا عکس متخل کیا ہے۔ اس لیے قرآنی اجازت، کے باوجود مسلمانوں کے ہاں بھی دوسری شادی کا تصور تقریباً ناقابل قبول بن کر رہ گیا ہے۔

وحی خداوندی کی رو سے دوسری شادی کا تصور اپنی روح کے اعتبار سے ایک مثبت عمل تھا اور ہے۔ جسے جہالت کے سبب، ہماری معاشرت میں منفی سمجھا گیا ہے۔ اس لیے تاکسین جانی کو باعوم اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ نکاح ثانی کے خلاف معاشرہ کی اس سپورٹ نے اس خالص فطری اور شرعی عمل کو چٹنی ہولناکی اور عورت پر ظلم کا عنوان دے رکھا ہے۔ اور اس رد عمل سے معاشرے میں غیر فطری اور غیر شرعی رویوں نے فروغ پایا ہے۔

ہمارے خیال میں نکاح جانی کو سو کن کے تصور سے ملو کرنے والوں نے دراصل قرآنی حسن معاشرت کے تصور کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ سو کن کا مروجہ تصور، غیر اسلامی معاشرہ میں تو ممکن ہے۔ اسلامی معاشرے میں انکی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں ملتی۔ کہاں تعدد ازواج کا قرآنی تصور اور کہاں

ہماری معاشرت میں سوت کا تصور۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

لفظ سوت کے اثرات ہمارے معاشرے پر ایسے نہیں پڑے۔ اور اس سوت سے سو تپا اور سوتیلی کے الفاظ بنائے گئے۔ اس لیے ناممکن تھا کہ سوت سے مشتق ہونے والے الفاظ میں اس کے بنیادی معنی نہ پائے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ سو تپا اور سوتیلی میں بھی سوت کی منفی معنویت پوری طرح موجود ہے۔ جبکہ لفظ سو تپا کے مقابلہ پر اسلام نے اخلاقی اور علاقائی کی اصطلاحیں پیش کی ہیں۔ (یعنی ماں شریک یا باپ شریک) اور یہ تعریفیں بھی بنائے ضرورت ہے تاکہ وراثت کے موقع پر جائز حقداروں کو ان کا حق دیا جاسکے۔ اور ان ہر دو الفاظ میں کسی قسم کا منفی مفہوم بھی شامل نہیں ہے۔ لیکن ہماری معاشرت میں رائج سو تپا کے لفظ میں تفریق کے ساتھ نظریں کا معنی بھی ہر کا ہوتا ہے۔ یعنی سوت کی نسبت کا مفہوم بھی۔ جو اپنی پیدائش کے وقت سے ہی حریف سمجھا لیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت میں چونکہ سو تپا کے مقابلہ پر ماں شریک یا باپ شریک کے الفاظ مستعمل ہوتے ہیں۔ اس لیے ماں یا باپ کی نسبت سے نکارے جانے والے بچوں میں باہمی نفرت و وحشت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ کیونکہ اس میں ماں یا باپ کی نسبت کا لحاظ جو ہوتا ہے۔ برخلاف سوتیلی بچوں کے کہ جن میں سوت کی نسبت ملحوظ ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سوت کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے اس لیے سوتیلی کو بھی اچھا نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی مفہوم کے لیے ادا کیے جانے والے الفاظ یا اصطلاحات نہ صرف اپنے اندر اپنے وضع کی پوری تاریخ رکھتے ہیں، بلکہ وہ اثرات کے اعتبار سے معاشرت پر مستولی بھی رہتے ہیں۔ کوئی معاشرہ بھی ان لفظوں کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔ لفظوں کی اثر آفرینی اور طاقت پر سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

مسلم معاشرہ کی اپنی الگ پہچان ہے جو اپنے معتقدات و نظریات اور قانون تعامل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے رسم و رواج اور عرف و عادت بھی اس کے لیے شناخت کا کام انجام دیتے ہیں لیکن مسلم سماج میں لفظوں کے لحاظ احتساب کے باعث اگر کوئی مثبت عمل، منفی معنی دینا شروع کر دے، تو اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرہ کو ان الفاظ کا تباہ فرام کریں، تاکہ منفی الفاظ کو ترک کیا جاسکے۔

چونکہ سوت اور سو تپا کے الفاظ میں جس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے وہ منفی طرز عمل کے سوا کچھ نہیں۔ جبکہ یہی حقیقت قرآن مجید میں ایک مثبت عمل کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ اس لیے معاشرہ میں رائج ان اصطلاحات کو شرف پر قرآن کرتے ہوئے، تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ان اصطلاحات کے ترک سے معاشرہ میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہونے کے امکان کو بہر حال رد نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن مجید نے کسی خاوند کی پہلی بیوی کو جس طرح زوج کہا ہے اسی طرح انکی دوسری بیوی کو بھی زوج ہی کہا ہے۔ سوت نہیں کہا۔

وان اردتم استبدال زوج مکان زوج۔ (النساء ۳۴)

اور جب تم ایک بیوی کو دوسری بیوی سے بدلنا چاہو۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ شوہر کی زندگی میں آنے والی ہر بیوی، خواہ وہ پہلی ہو یا دوسری، بطور زوج کے ایک مستقل حیثیت اور مقام کی مالک ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ پہلی بیوی زوج ہو اور بعد میں آنے والی سوت ہو یا دونوں ایک دوسرے کی سوت ہوں۔ یہ تصور قرآن کے مطابق اس لیے نہیں ہے کہ قرآن نے رخصۃ ازدواج کو ازواجاً لتسکُنوا لیہا وجعل بینکم مودة ورحمة۔ (الروم ۲۱) اور لتسکُنوا لیہا (الاعراف ۱۸۹) کے الفاظ سے انکی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رخصۃ ازدواج میں تمہارے لیے تسکین اور باہمی مودت و رحمت رکھی گئی ہے۔ پھر برعکس قرآن یہ رشتہ بالعموم صورت احدی میں قائم ہوتا ہے۔ اور گاہ بگاہ صورت تعدد میں بھی۔ اس لیے دونوں صورتوں میں تسکین اور باہمی مودت و رحمت کا عنصر یکساں طور پر تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ مرد کی اگر ایک بیوی ہو تو وہ تسکین کا باعث ہو۔ اور اگر وہ چار سوتیں تو موجب تکلیف بن جائیں۔ اگر صورت معاملہ یہی ہوتی تو اللہ عظیم و خیر، رؤف و رحیم ایسا سختی و نفرت آگئیں، وحشت خیز، اور عقلی حکم بھی نہ دیتا۔

غور کیجئے! اگر وہ یادو سے زائد بیویاں اپنی اصل میں ایک دوسرے کی حریف، رقیب اور دشمن ہوں تو ان کے مابین منافرت، مناقضت اور متنازعیت کیا ان کے شوہر پر اثر انداز نہیں ہوگی؟ جس کے نتیجے میں وہ شوہر اپنی بیویوں سے بجائے تسکین پانے کے، تکلیف نہیں پائے گا؟ اور اس طرح تعدد ازدواج کا حکم، ایک منطقی حکم بکر، شریعت اسلامی کے نقص کا ایک چٹا پھرتا ثبوت نہیں بن جائے گا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سارا شاخسانہ لفظ سوت کے اس تصور کا ہے کہ جس نے اسلام کے تعدد ازدواج کے تصور کو گہرا دیا ہے۔

عورتوں کے لیے ان کے شوہروں کی پہلی بیویوں کے بیٹوں کے حق میں قرآن نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ قابل توجہ ہیں، اُولُو اٰہْتَابَعُو لَہُنَّ۔ یا شوہروں کے بیٹے (النور ۳۱)

یہ نہیں کہا کہ سوتیلے بیٹے۔ یعنی بیٹوں کو سوت سے نہیں بلکہ ان کے شوہروں سے نسبت دی گئی ہے۔ مگر مذہب فہر کی معاشرت کے زیر اثر ہم اس رشتے کو اپنے پن کی بجائے سوتیلے پن کا رشتہ سمجھے بیٹھے ہیں اور اس لیے دوسری شادی کو محبوب سمجھتے ہیں کہ جس کے نتیجے میں اپنے تئیں سوتیلہ رشتہ وجود میں آتا ہے۔ یہ ہمارے معاشرہ کی جہالت ہے۔ قرآن کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اس طرح 'رباعب' کا لفظ دیکھئے:

وَرَبَّاعِبُکُمُ النِّسَاءُ فَمِنْ حِجْرٍ کَمِنْ نِسَاءِکُمْ۔ (النساء) اور تمہاری عورتوں کی وہ بیٹیاں، جو ان کے پہلے شوہروں سے ہوں اور تمہاری پرورش اور تربیت میں ہوں۔

اس آیت میں لفظ 'رباعب' توجہ طلب ہے۔ یہ ربوبہ کی جمع ہے۔ جو فعل کے وزن پر معنی مقول میں ہے۔ یعنی 'مربوبہ' جس کا مطلب ہے وہ لڑکی جس کی پرورش اور تربیت کی جائے اس لیے یہ خوشگوار فریضہ انجام دینے والے مرد (باپ) کو 'ربا' کہتے ہیں۔

'امام راعب کے بقول لفظ 'ربا' اور 'ربا' خاوند اور بیوی دونوں سے مخصوص ہے۔ جس وقت کہ وہ پہلے زوج کے بچے کی پرورش اور تربیت کریں۔ اس معنی پر وہ بچہ بھی ربیب یا ربوبہ کے لفظ سے مخصوص ہے۔

واختص الربا والرباۃ باحد الزوجین اذ الولی ضربۃ الولد من زوج کان قبلہ والربیب والربیبۃ بذلک الولد۔ (۵)

اس کا مادہ 'رب' ہے، جس کے بارے میں المفردات میں لکھا گیا ہے۔

الرب فی الاصل التربیۃ وهو انشاء النشۃ حالاً فصلاً الی حدّ القسام (۶) رب اصل میں پالنے اور تربیت کرنے والے کو کہتے ہیں یہ وہ ہستی ہے۔ جو کسی چیز کو بتدریج ترقی دیتے ہوئے کمال کی آخری حد تک پہنچا دے۔

اور اس معنی میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی رب کہلانے کا مستحق نہیں۔ الحمد للہ رب العالمین۔ اور قرآن مجید نے والدین کو جو چھوٹا رب، کہا ہے گمنان نبیانی صغیرا۔ (اسراء ۲۳) انکی اصل بھی یہی ہے کہ ماں باپ بھی اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت اسی انداز میں کرتے ہیں کہ انہیں اپنی حیثیت، توفیق اور بساط کے مطابق، آہستہ آہستہ درجہ کمال تک پہنچاتے ہیں۔

وضاحت مذکورہ سے با آسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ لفظ ربوبہ، اپنے اندر معدنی وحدثیت مفہوم رکھتا ہے۔ یعنی ربوبہ وہ رشتہ ہے۔ جو اپنی حقیقی اولاد کے معاملے مفہوم کا حامل ہے۔ اس میں 'سوتیلے پن' کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ پھر یہ کہ اسے عورت کے پہلے شوہر سے منسوب کیا گیا ہے اس لیے بھی انہیں سوتیلے پن کا کوئی تصور داخل نہیں ہوتا کہ مردوں کے لیے 'سوت' کا لفظ ناقابل استعمال ہے۔ چنانچہ جو لوگ ربوبہ کا مطلب 'سوتیلے لڑکی' سے ادا کرتے ہیں۔ وہ قرآنی لفظ کے معنی حسن و کمال کو غارت کرتے ہیں۔ اس غارت گری کا ایک نمونہ علمی اردو لغت میں ربیب کے معنی میں ملاحظہ ہو۔

سوتیلا بیٹا، جو پہلے خاوند سے ہو۔

اس مثال میں وہی غلطی پائی جاتی ہے جو زوج آخری کو سوت کے لفظ سے تعبیر کرنے میں لوگوں سے ہوتی تھی مگر اس میں کہ یہ غلطی صرف اردو لغت و ادب تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہمارے تفسیری ادب تک جا پہنچی، تفسیر نبوی میں لکھا ہے۔

”یہاں روپیہ سے مراد وہ لڑکی ہے جو اپنی بیوی کے پیٹ سے ہو، دوسرے خاوند سے یعنی سوتیلی بیٹی، چونکہ عموماً سوتیلی لڑکی ماں کے ساتھ رہتی ہے، اور سوتیلا باپ ہی اسکی پرورش کرتا ہے۔ اس لیے روپیہ کہتے ہیں۔“ (۷)

مذکورہ بالا عبارت میں سوتیلی بیٹی، سوتیلی لڑکی اور سوتیلا باپ، کے الفاظ سے جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے لفظ روپیہ کی قرآنی معنویت کا حسن و جمال ماند پڑ گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر لکھا گیا ہے۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ مذکورہ عبارت میں مسلمانوں کی معاشرت میں ہندی معاشرت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے اردو کے تفسیری ادب میں یہ الفاظ، ہائے انداز دیگر، سوتیلوں کے تعلق سے دوسرے مفسرین کے ہاں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحتی مجمع بین الاخین کی ممانعت کی علت، کے زیر عنوان رقمطراز ہیں:

”قرآن حکیم انسانی فطرت کے اس تقاضے کو ابھارنا چاہتا ہے کہ جہاں رگی رشتے کی قربت قریب موجود ہو۔ وہاں باہمی ارتباط کی فطری بنیاد رافت و رحمت ہی ہونی چاہیے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان اسباب کو دیا جائے جو رجمی رشتوں کے اندر رشتہ و رقابت کا زہر گھولنے والے ہوں۔ چونکہ دو بہنوں کے بیک وقت کسی کی قید نکاح میں ہونے کی صورت میں اس کا غالب امکان ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیش ہوتے ہوئے بھی سوتیلوں کے جلاپے اور رشتہ و رقابت کے جذبات میں جھلا ہو جائیں، اس وجہ سے اس کا دروازہ بند کر دیا ہے۔“ (۸)

محمد کرم شاہ الا زہری رقمطراز ہیں:

”دو بہنوں کو خواہ وہ حقیقی ہوں یا رضاعی، ایک نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، اور حضور کریم ﷺ نے پھر بھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی کا ایک عقد میں جمع کرنا منع فرمایا ہے اور اسکی وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہ رشتے محبت و پیار کے رشتے ہیں، اگر یہ ایک دوسرے کی سوتیلی بن جائیں گی تو محبت و انس کی جگہ حسد و عناد، جو عام طور پر سوتیلوں میں پایا جاتا ہے رونما ہو جائے گا۔“ (۹)

تفسیر نمونہ کے مفسر ارقام فرماتے ہیں:

”اسلام نے اس قسم کی شادی سے کیوں روکا ہے۔ شاید اسکی رمز یہ ہو کہ دو بہنیں طبعی اور فطری نسب سے رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں۔ لیکن جب وہ ایک دوسرے کی رقیب بن جائیں گی تو وہ فطری محبت باقی نہ رہے گی بلکہ ایک قسم کا تضاد ان میں جنم لے گا جو اسکی زندگی کے لیے انتہائی مضر ہے کیونکہ ہمیشہ کے لیے جذبہ محبت اور جذبات رقابت ان کے دلوں میں باہم برسر پیکار رہیں گے۔“ (۱۰)

مولانا قلام رسول سعیدی اور قلام فرماتے ہیں:

”اس نکاح کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ رحم کے رشتے ہیں اور سوتیلوں میں عداوت اور جلاپا ہوتا ہے، سوا گرد و بہنوں، خالہ اور بھانجی دونوں کو ایک نکاح میں جمع کر لیا جائے تو یہ صلہ رحم کے منافی ہے اور قطعیت رحم کو مستلزم ہے۔“ (۱۱)

دو حقیقی، علقائی، خلیفائی اور رضاعی بہنوں نیز خالہ بھانجی اور چچو بھی بھتیجی کے بیک وقت نکاح میں جمع نہ کرنے کی حکمت آپ نے مذکورہ بالا مفسروں کی زبانی ملاحظہ فرمائی۔ اس کا خلاصہ ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں۔ دو بہنوں کے بیک وقت کسی کے نکاح میں ہونے کی صورت میں بہت ممکن تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیش ہونے کے باوجود، سوتیلوں کے جلاپے اور رشتہ و رقابت کے جذبات میں جھلا ہو جائیں۔ اور سوتیلی بننے کی صورت میں ان میں باہمی محبت و انس کی جگہ حسد و عناد رونما ہو جاتا، جو عام طور پر سوتیلوں میں پایا جاتا ہے۔ سوتیل بن جانے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کی رقیب بن جائیں، ان میں ایک قسم کا تضاد پیدا ہو جاتا جو ان کی زندگی کے لیے انتہائی مضر ہوتا۔ چونکہ سوتیلوں میں عداوت اور جلاپا ہوتا ہے جو صلہ رحمی کو قطع رحمی کو لازم کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے مذکورہ مفسرین کی تفسیروں میں آپ نے سوتیلوں کے الفاظ و تصورات ملاحظہ فرمائے جو سب کے ہاں مختلف طور پر مثنی، متضاد و مطالب پر مشتمل ہیں۔ دراصل ہم یہی دکھانا چاہتے تھے کہ ہمارا تفسیری ادب بھی اپنے علم و فضل کے باوجود معاشرتی رویوں اور اردو لغت و ادب کا شکار ہونے سے بچا نہیں۔ کا ہے۔

ان حوالوں کا حاصل یہ نکلا کہ سوتیلوں کا رشتہ چونکہ اچھا نہیں ہوتا۔ اس لیے اللہ رب العزت نے دو بہنوں میں اسے پسند نہیں فرمایا مگر ساتھ ہی یہ نتیجہ بھی نکلا کہ دو بہنوں کے سوا باقی خواہن میں باہمی جلاپے رشتہ و رقابت، حسد و عناد اور زندگی کے تضاد پر مشتمل اس مثنی رشتے کو پسند کر لیا گیا ہے۔ (۱۲)

نتیجے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں) اگر اسلام کا تعدد و ازدواج اپنے نتیجے کے اعتبار سے انہی مطالب پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا تو گستاخی معاف کیا قانون خداوندی کی ایسی تفسیر کو توہین قانون کے ذیل میں نہیں لیا جاسکتا؟ یہ ہم سب کے سوچنے کا مسئلہ ہے۔

کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

ہم سمجھتے ہیں کہ خدائی شریعت، اپنے ہر حکم میں کامل و مکمل اور ہزار باخوبیوں اور حکمتوں پر مشتمل ہے، البتہ مسلمانوں کا اس پر، اسکی اسپرٹ کے مطابق عمل نہ کرنا، شریعت کے نقص یا اسکی معنی بر غلط ہونے کی دلیل نہیں بنتا۔ بلکہ خود مسلمانوں کے معنی بر غلط ہونے کی دلیل بنتا ہے۔ خدائی احکام، ہمیشہ سے ناقابل شکست رہے ہیں۔ لوگوں نے اگر اپنی فطرت کو مسخ کر لیا ہو تو اس میں شریعت کا کیا قصور؟

آنکھیں اگر ہوں بند تو پھر دن بھی رات ہے

اس میں قصور کیا ہے بھلا آفتاب کا

حوالہ جات

- ۱۔ ملکی اردو لغت (جامع) ادارت میرسرہندی، ص ۹۷، ملکی کتاب خانہ کبیر سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، طبع ۲۰۰۰ء
- ۲۔ ملکی لغت ص ۹۲۶
- ۳۔ کتابستان کپڑت ڈسٹری، ص ۳۸۹، شیر احمد قریشی، کنایستان جلی کیشنر کھٹی، ۳۸، اردو بازار، لاہور، ترجم شدہ اپریل ۱۹۹۸ء
- ۴۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۱۳، ص ۱۷۷، اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ) کراچی۔ ۱۹۹۱ء
- ۵۔ المفردات فی غریب القرآن (عربی) ص ۱۸۵، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام پور، کراچی
- ۶۔ ص ۱۸۳
- ۷۔ ملحق احمد یار خان شمیم، اشرف الشاہ المعروف بہ تفسیر نسیمی، جلد ۳ ص ۹۳۲، تفسیر زیر آیت الشہادۃ، ۲۳، مکتبہ اسلامیہ، ملحق احمد یار خان روڈ، کمرات۔ پاکستان
- ۸۔ تہ قرآن، جلد ۶، ص ۶۷، اداران فاؤنڈیشن، ۱۲۲، فیروز پور روڈ، ناچر، لاہور، طبع اول ۱۹۸۳ء
- ۹۔ فیہ القرآن، جلد اول، ص ۳۳۳، تفسیر زیر آیت الشہادۃ، ۲۳، فیہ القرآن ونبلی کیشنر، گنج بخش روڈ۔ لاہور۔ ۲۰۰۲ء
- ۱۰۔ تفسیر موش، جلد ۲، ص ۴۱، مژدہ مولانا سید محمد حسین نجفی، مصباح القرآن، دارالمرتب، لاہور، ۱۹۷۶ء
- ۱۱۔ تہ قرآن، جلد ۳، ص ۶۲۳، مژدہ مولانا، ۳۸، اردو بازار، لاہور، طبع اول ۲۰۰۱ء

.....

اسلامی قانون کے ارتقاء میں اجتہاد کا کردار

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری

ممبر، اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان

مصر کے معروف عالم مرحوم ڈاکٹر احمد امین نے مسلم دنیا کے فکری انحطاط پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ: تقریباً پانچ سو سال سے مسلمانوں نے فکری میدان میں جو کچھ لکھا ہے، اگر اسے غرق دریا کر دیا جائے تو اس سے علم و ادب کو کوئی نقصان نہیں اٹھاتا چڑے گا۔ ہر چند ڈاکٹر موصوف کی تنقید میں قدرے شدت پائی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے مسلمانوں کے فکری زوال کو بیان کرنے اور انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے وہی کچھ کہا ہے جو ان سے پہلے دور حاضر کے مسلم مفکرین کہہ چکے ہیں۔ مسلم مفکرین نے اس دعوے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ شیخ جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا تھا: "یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، چہ معنی دارو؟ (قرآن و سنت) کی کس نص سے یہ دروازہ بند کیا گیا ہے۔ اور کس امام نے یہ کہا ہے کہ میرے بعد مسلمانوں کو دین میں بصیرت و ادراک حاصل کرنا مناسب نہیں ہے یا انہیں قرآن مجید اور حدیث صحیح سے ہدایت حاصل کرنی نہیں چاہیے یا ان کے مفہوم و مراد کی گہرائی میں اترنے اور اسے وسعت دینے کے لیے سعی و نشاط سے کام لینا نہیں چاہیے۔"

بے شبہ مسلم تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ مسلمان اپنے دور انحطاط میں اسی مرض میں مبتلا ہوئے جس میں ان سے قبل بعض دوسری مذہبی جماعتیں مبتلا ہو چکی تھیں۔ لیکن دوسری جماعتوں کا فکری جمود و قفل میں مبتلا ہونا چنداں حیرت انگیز نہیں کیوں کہ بقول رسل Russell ان کے مذہبی صحیفوں میں ہمیں ایک لفظ بھی ذہانت کی تعریف میں نہیں ملتا، رسل کا کہنا ہے کہ:

"So far as I can remember there is not one word in the

لیکن قرآن مجید نے بار بار انسانی فکر و عقل سے خطاب کرتے ہوئے ان لوگوں کی خدمت کی ہے جو کائنات کے حقائق و دقائق کا مشاہدہ کرنے سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں، جو قدم قدم پر تاریخ کے نشانات پر غور و فکر کرنے سے انکار کرتے ہیں قرآن نے ایسے لوگوں کی عقل و دانش اور ہوش و حواس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے پاس عقل ہے، لیکن سوچ بچار سے کام نہیں لیتے ان کے پاس آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں ان کے پاس کان ہیں لیکن سنتے نہیں یہ لوگ مگر ایسی میں حیوانات سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ (الاعراف، آیت نمبر ۷۷)

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ قرآن مجید، اسلامی فکر کا بنیادی ماخذ ہے اور انسانی سعادت و ہدایت کا سرچشمہ، چنانچہ جب قرآن مجید اور رسول کریم ﷺ کی تعلیم و تربیت سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی فکری صلاحیتوں کو بیدار کیا اور ان کی بے کیف زندگیوں میں معنویت پیدا کی، تو انہوں نے روحانی طور پر ایک نیا جنم لیا، اب قرآن ان کی فکر و نظر کا مرکز تھا۔ اس کی تعلیمات اور اس کے اسرار و حکم ان کی سوچ بچار کا محور، انہوں نے قرآن مجید کے فلسفہ و حکمت کو سمجھنے کے لیے مقدور ہر محنت سے کام لیا، یہی فکری ریاضت ہے جسے ہم آج اجتہاد سے یاد کرتے ہیں۔ سچوں کا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اپنی ذاتی صلاحیتوں میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس لیے قرآن انہی اور اس کے حقائق و معانی کے ادراک میں بھی وہ یکساں مقام نہیں رکھتے تھے۔ اگر انہیں قرآن کے کسی مقام پر کوئی مشکل پیش آتی تو وہ آنحضرت ﷺ سے رجوع کرتے، اور آنحضرت ﷺ بعض اوقات کسی مسئلہ کو کسی بزرگ کے حوالے کر دیتے، جو آپ کی موجودگی میں اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے، اس سے مقصد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی فکری صلاحیتوں کو جلا بخشنا تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نہ صرف قرآن مجید کے معانی پر غور و فکر کرتے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے فرمودات پر بھی سوچ و بچار کرتے۔ اور وہ الفاظ کے ظاہری معانی کے ادراک پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں علماء نے متعدد واقعات نقل کیے ہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ہم احزاب کے موقع پر فرمایا کہ نماز عصر بنی قرظہ پہنچ کر ادا کی جائے گی لیکن ہوا یہ کہ راہی میں وقت نماز آگیا۔ جس پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے کہا کہ ہم تو منزل پر پہنچ کر ہی نماز پڑھیں گے، لیکن دوسرے بزرگوں نے فرمایا کہ نہیں! ہم تو ابھی نماز پڑھیں گے، رہا رسول کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ منزل پر پہنچنے سے پہلے نماز پڑھی جائے تو اس فرمان کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں جلدی اور تیزی سے کام لینا

چاہیے۔ ورنہ یہ مطلب نہیں کہ راہ میں نماز ہی نہ پڑھی جائے۔ لہذا جب آنحضرت ﷺ کے سامنے اس واقعہ کا ذکر آیا تو آپ ﷺ نے کسی فریق کو ہدف ملامت نہیں بنایا۔ یعنی جن بزرگوں نے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے فرمان کا مطلب منزل تک جلد پہنچنا تھا، نماز پڑھنے سے روکنا نہیں تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ آخر تم لوگوں نے حدیث کے ظاہری مفہوم و مراد پر عمل کیوں نہیں کیا۔ اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ بھی آنحضرت ﷺ کے سامنے ہی پیش آیا۔ جب قبیلہ بنی النضیر سے جنگ کا واقعہ پیش آیا تو مسلمانوں نے خالص جنگی نقطہ نظر سے بعض درختوں کو کاٹ دیا جو عاصمہ کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ یہ امر یعنی درختوں کا کاٹنا ظاہر قرآن کی اس آیت کے خلاف تھا جس میں فساد فی الارض کی مذمت کی گئی ہے۔ قرآن نے فرمایا ہے

وَإِذَا تَوَلَّى سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ

یعنی جب یہ مفید برسرِ اقتدار آتے ہیں تو فصلوں اور فصلوں تک کو برباد کر دیتے ہیں۔ لہذا جب ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں مسلمانوں کی طرف بڑھی تو خلیفہ راشد نے ان سے فرمایا۔ ”وکیفنا یجمل دار و درختوں اور فصلوں کو نہ کاٹنا، نیز یہ کہ انسانی کشتیوں کو ویران نہ کرنا۔“ چنانچہ جب جنگی مصلحت کے پیش نظر بنی النضیر کے درختوں کو کاٹا گیا تو انہوں نے شور مچایا کہ محمد ﷺ ایک طرف تو فساد فی الارض سے روکتے ہیں لیکن دوسری طرف خود ان کے ساتھی درختوں کو کاٹ رہے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے اس اجتہادی قدم کو کہ جنگی ضرورت کے پیش نظر درختوں کا کاٹنا گزیر تھا۔ قرآن مجید نے سورہ البقرہ میں جائز قرار دیا اور اسے فساد فی الارض سے تعبیر نہیں کیا۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید کی کسی شخص کے عمومی حکم کو کسی دوسری مصلحت کے پیش نظر (جس کا ادراک انسانی عقل نے مقدور ہر سوچ کے بعد کیا ہے اور قرآن و سنت کے فلسفہ و حکمت کی روشنی میں کیا ہے) محدود کیا جاسکتا ہے۔

آج اور احادیث میں ایسے کئی واقعات کا تذکرہ آیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے کسی قرآنی نص یا حدیث کا مفہوم نہیں سمجھا تھا۔ تو آں حضرت ﷺ یا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے انہیں صحیح مفہوم سے آگاہ فرمایا، اس قسم کے واقعات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں جب ممتاز صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن یا آنحضرت ﷺ کے فرمودات مبارک کی تشریح میں اجتہاد سے کام لیا تو آنحضرت ﷺ نے اسے پسند فرمایا کیونکہ ان کا اجتہاد درج

شریعت یا روح عدل سے قریب تھا اور شریعت کے بنیادی مقاصد کو پورا کر رہا تھا۔ لیکن وجہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایسے اجتہاد پر مسرت کا اظہار فرمایا۔ آپ ﷺ نے ایک بار حضرت معاذ بن جبل سے جو یمن میں گورنر بن کر جا رہے تھے۔ فرمایا کہ اگر تم قرآن و سنت میں کسی قضیہ کا حل نہ پاؤ تو پھر کیا کرو گے؟ تو پھر میں اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا (احمد برائی) حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں عرض کیا۔ رسول کریم ﷺ نے اس جواب کو پسند فرمایا۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اپنی جس رائے یا اجتہاد کا ذکر کیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی رائے کو اختیار کرنے کا مشورہ قاضی شریعہ کو دیا تھا۔ آپ نے قاضی صاحب موصوف کو لکھا تھا کہ اگر تمہیں فیصلہ کرتے وقت اللہ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں اور آئمہ سے کوئی چیز نہ ملے تو پھر اپنی رائے سے کام لیتے وقت خوب محنت سے کام لو اور اہل علم سے مشورہ کرو (فاجتہد بمرأیک واستشیر اهل العلم والاصلاح) اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

”میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں بعض اوقات ایسے امور سے واسطہ پڑتا ہے جن کے بارے میں نہ تو قرآن مجید میں کچھ نازل ہوا ہے اور نہ ہی آپ کی سنت نے کوئی فیصلہ دیا ہے۔“ اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

”اویسی صورت میں مؤمنین میں سے اہل علم کو اکٹھا کرو اور زیر بحث مسئلہ کو باہمی مشورہ سے طے کرو اور کسی ایک رائے پر (غیر مشورہ) فیصلہ نہ دو۔“

ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح ہوگا کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجماع میں اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ زندگی تغیر پذیر واقع ہوئی ہے اور نیا دن، نیا وقت اپنے جلو میں نئے مسائل اور نئی مشکلات لاتا ہے، جن سے مسلمان مسلسل غور و فکر اور باہمی صلاح مشورہ ہی سے عہدہ بردار ہو سکتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجماع کے اجتہاد اور رائے کا دائرہ وسیع نہیں تھا۔ انہیں جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو وہ آنحضرت ﷺ سے پوچھتے، آپ یا تو انہیں قرآن مجید کے احکامات سے آگاہ فرماتے یا اپنی طرف سے کوئی فیصلہ صادر فرما دیتے، یہ فیصلہ قرآن مجید ہی کے احکام کی تشریح و تفسیر شمار کیا جاتا۔ مثلاً قرآن نے ماں بنی، یا دو بہنوں سے ایک ہی وقت میں شادی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے اس حکم میں مزید اضافہ فرمایا کہ چھو بھی اور بھینسی یا خال اور بھانجی

سے بھی ایک ہی وقت میں عقد نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ﷺ کے وصال کے بعد اجتہاد کا دائرہ وسیع ہوا۔ اب جدید مسائل اور مشکلات کے حل کے لیے آپ کی ذات گرامی، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجماع کے درمیان موجود تھی۔ جس کی وجہ سے فلسفہ قرآن و سنت کی روشنی میں انسانی عقل و بصیرت کو کام کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوئے۔ جس سے اجتہاد کو ایک بلند مقام نصیب ہوا۔ اور اسے اسلامی تشریع میں تیسرا بنیادی ماخذ شمار کر لیا گیا۔ لیکن یہ اجتہاد جسے رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجماع نے لفظ رائے بھی کہا ہے۔ عموماً اجتماعی مشورے کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا تھا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں خاص طور پر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں مدینہ میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجماع کا اجتماع ہوتا اور زیر بحث قضیہ پر آزادانہ غور و فکر کے بعد کسی ایک رائے لازمی قرار دیا گیا اور اسی اجتماعی رائے کو اجماع سے بھی تعبیر کیا گیا۔ اس اجتماعی رائے کی صحت پر علماء نے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۱۵ سے استدلال کیا ہے۔ اس آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير تعليمه المؤمنين
نوله ما تولى.

یعنی جو آدمی رسول ﷺ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو اور اہل ایمان کی راہ کے سوا کسی اور راہ پر چلے حالانکہ اس پر راہ ہدایت کھل چکی ہے تو اس کو ہم اسی راہ پر چلائیں گے جس پر وہ خود چلے گا۔ اسی معنی میں آنحضرت ﷺ سے ایک روایت بھی مروی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ میری امت لفظی پر یک جہ نہیں ہوگی۔

یہاں یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اجتہاد کا یہ شرف صرف انہی بزرگوں رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجماع کے حصہ میں آیا جنہیں خدا نے حکمت و دانش سے نوازا تھا اور قرآن بھی کا خاص ذوق و طاف فرمایا تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجماع نے نہ صرف سیاست اور معیشت کے مسائل میں اجتہاد فرمایا اور نئے نئے تجربے کیے بلکہ ان مسائل میں بھی اجتہاد فرمایا جس میں قرآن و سنت اپنا فیصلہ دے چکے تھے۔ لیکن جدید وقت کے تقاضوں کے پیش نظر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجماع نے نصوص کی تشریح و تاویل میں حق و صداقت کی نئی نئی جہتوں کو دریافت کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجماع نے جو اجتہادات فرمائے اہل علم نے ان کے تین درجہ قرار دیے ہیں:

۱۔ ان اجتہادات کا تعلق قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر سے تھا۔

۲۔ کسی زیر بحث مسئلے کو کتاب و سنت میں اس سے ملنے جملے مسائل، یعنی امثال و اشباہ پر قیاس کرنا۔

۳۔ اجتہاد کا کسی خاص معین نص پر اعتماد کرنے کے بجائے روح شریعت پر اعتماد کرنا۔ علماء نے کہا ہے کہ شریعت مقدسہ کا منہجائے نظر مخلوق کی بھلائی ہے۔ جس جگہ یہ بھلائی پائی جائے گی وہی شریعت ہوگی۔ یہ اجتہاد میں یہ بات بھی پیش نظر رکھی گئی کہ جس چیز کو مسلمان جماعتی طور پر بہتر جانتے ہیں وہ چیز عند اللہ بھی حسن اور بہتر ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد میں چند ایسے احکام بھی جاری کیے، جو بظاہر قرآن کے صریح حکم سے متصادم نظر آتے ہیں۔ یا آپ نے بعض احکام کو موقوف کر دیا، جن پر عہد رسالت میں عمل ہوتا تھا۔ مثلاً جب عراق اسلامی ریاست کا حصہ بنا تو آپ نے عراق کی زمینوں کو فوجیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ریاست کی ملکیت قرار دیا۔ مفتوحہ اراضی کی تقسیم کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کئی رد تک صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے بات چیت کی۔ اس مسئلہ پر دورائیں تھیں۔ بعض بزرگوں کا کہنا تھا کہ ان زمینوں کو فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جیسا کہ خود رسول کریم ﷺ نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم فرما دیا تھا۔ دوسری رائے یہ تھی کہ ان زمینوں کو ریاست کی ملکیت میں دے دیا جائے۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اس رائے کے حق میں تھے یہاں تک کہا: اگر آپ نے (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ان زمینوں کو تقسیم کر دیا (اور ریاست کی تحویل میں نہ دیا) تو یہ لوگ (فوجی) بہت بڑے سرمایہ کے مالک بن جائیں گے ان کے مرنے کے بعد یہ ساری جائیداد کسی ایک آدمی یا عورت کی طرف منتقل ہو کر رہ جائے گی۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر معروف دہلوی نے لکھا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تقریر میں اسی چیز کی (اکتفا دولت) مذمت کی ہے، جس کی برائی آج کے سوشلسٹ کر رہے ہیں، یعنی اللہ کی وسیع سر زمین بالآخر ایک شخص کی ملکیت میں آجائے گی جس پر کاشت کاروں کی ایک بڑی جماعت کام کرے گی جن کی محنت پر ایک آدمی داد میس دے گا۔ یہ قطعہ عراقی زمینوں کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے موقف کی حمایت میں سورۃ احقر کی آخری آیات سے استدلال کیا۔ جن میں کہا گیا ہے کہ "سرمایہ صرف مالدار آدمیوں ہی میں گردش نہ کرنا رہے"۔ بالآخر مہاجرین اور انصار کے اربابہ عمل و عقد نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رائے سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ ان اراضی کو ریاست کی تحویل میں دے دیا جائے۔"۔

انہی اجتہادات میں سے ایک اجتہاد یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرب سوسائٹی

کے خدای کی رسم کو ختم کرنے کے لیے قانونی قدم اٹھایا، اور فرمایا کہ آئندہ کسی عرب کو غلام نہیں بنایا جاسکے گا یا جو باہمی صاحب اولاد ہوگی اس کی خرید و فروخت ممنوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اجتہادات میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن مجید کی کسی نص کو معطل یا موقوف نہیں کیا بلکہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر قرآنی نصوں کی جدید تعبیر کی، جو شریعت کے مزاج اور فلسفہ حکمت سے مطابقت رکھتی تھی یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جدید حالات کے پیش نظر اپنے ہی ایک فیصلہ کو دوسرے وقت میں بدل دیا تھا۔ مثلاً آپ نے میراث کے قضیہ میں حقیقی اولاد کو میراث سے محروم رکھنے کا فیصلہ دیا۔ لیکن جب یہی مسئلہ ایک عرصہ کے بعد دوبارہ ان کے سامنے آیا تو انہوں نے حقیقی اولاد اور ماں میں شریک اولاد دونوں کو میراث میں حصہ دینے کا فیصلہ صادر فرمایا۔ جب آپ سے آپ کے پہلے فیصلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا: پہلا فیصلہ وہی تھا جو ہم نے (اپنے اجتہاد کے مطابق اس وقت) صادر کیا تھا، اور یہ فیصلہ جو ہم اب دے رہے ہیں (اس اجتہاد کے مطابق ہے)۔ "ذلک، ما قضینا و هذا علی ما نقضی"۔ یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہ صرف اپنے ایک فیصلہ کو دوسرے اجتہادی فیصلے سے بدلا، بلکہ اپنے عہد خلافت میں بعض ان فیصلوں کو بھی بدل دیا، جو خلیفہ کول نے اپنے زمانہ میں دیے تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان فیصلوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہ ہوگا۔

۱۔ ایک مجتہد اپنی ایک اجتہادی رائے کو دوسری رائے سے بدل سکتا ہے۔

۲۔ ایک مجتہد حاکم اپنے سے پیشرو مجتہد حاکم کے فیصلوں کا پابند نہیں۔

۳۔ ہر نسل کو اپنی مشکلات خود ہی حل کرنی چاہئیں، اس کے لیے اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے اپنے سے پہلی نسل کے فیصلوں کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے جنہیں اللہ نے مجتہدان بصیرت عطا فرمائی تھی کہا ہے: "عہد حاضر میں مسلم دنیا کے رہنماؤں کا فرض ہے کہ مغرب میں جو انقلاب رونما ہوا ہے اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پھر پورے اعتماد (مضبوط نفس) اور گہری بصیرت کے ساتھ اسلام کے منہجائے اہداف Ultimate Aims کو بحیثیت ایک اجتماعی سیاست Social Polity پیش کریں"۔

علامہ نے مزید فرمایا: "قرآن مجید کی تعلیمات جو زندگی کو ایک ترقی یافتہ حقیقی عمل گردانتی ہیں یہ ضروری قرار دیتی ہیں کہ ہر نسل کو جو اپنے اسلاف کے (حقیقی) کام سے روشنی حاصل کرتی ہے۔ اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ اپنے مسائل کو خود سمجھائے"۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت: "ما